AL-HAYAT Research Journal
Volume 3 Issue 4 (July-Sep 2026)
HJRS HEC Journal Recognition System Category Y
ISSN (Online): 3006-4767
ISSN (Print):: 3006-4759

جدید اُردو افسانے میں تعلیمی شعور کا اظہار

Representation of Educational Consciousness in Modern Urdu Fiction

Dr. Muhammad Zafar Iqbal
Department of Urdu, F.C College University, Lahore, drmuhammadzafariqbal@fccollege.edu.pk

Prof. Dr. Waheed Ur Rahman Khan
Department of Urdu, DIOL, University of Education, Lahore, waheed.rahman@ue.edu.pk

Abstract

Modern Urdu short story serves as a profound reflection of contemporary social consciousness. A significant facet of contemporary life is "education," which encompasses diverse social, political, economic, and psychological dimensions. Modern Urdu short stories skillfully depict these varied perspectives and contextual nuances, critically highlighting administrative dynamics, prevailing concepts, and institutional realities of academic life. Furthermore, educational environments and pedagogic activities are articulated with cognitive depth and critical awareness through compelling narratives and characterization. This research paper explores the representation of educational consciousness within modern Urdu short stories, encompassing various dimensions of Pakistan's educational system. To substantiate the critical discourse, representative and meaningful textual excerpts from the works of modern short story writers have also been incorporated and analyzed.

Keywords: Modern Urdu Short Story, Educational Consciousness, Contemporary Urdu Fiction, Pakistani Education System, Socio-Educational Discourse, Textual Analysis

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش جدید اور افسانے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ”جدید افسانے میں عصری شعور بھی موجود ہے اور اس میں سماجی ذمہ داریوں کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ اصل میں جدید اُردو افسانے نے سیاسی، معاشی، معاشرتی، جنسی اور نفسیاتی زاویوں کو ایک بالکل نئے پیرائے میں بیان کرنے کی سعی کی ہے اور فرد کی فکری، جذباتی اور احساساتی دُنیا نیز اس کی داخلی کشمکش، انتشار، کرب، بد دلی اور مشینی ماحول کی پیدا کردہ زندگی کی بے معنویت، یکسانیت، تنہائی اور بے چارگی کو موضوع بنایا ہے۔“ (۱)

اکیسویں صدی کے اُردو افسانے نے جدید زندگی کے احوال اور مسائل کو پیش کیا ہے چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو افسانے میں دورِ حاضر کی تعلیمی سرگرمیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور تعلیمی رجحانات، مشکلات، نظریات اور انتظامات کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے، نیز تعلیمی ماحول، نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں، تدریسی طریق کار، سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے طرزِ تعلیم کے تفاوت کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ افراد کے طرزِ عمل پر بھی بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ تعلیم کی بدولت ہی ایسے افراد پیدا کیے جاسکتے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں معاشرے کی خدمت اور رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ تعلیم ہی ہر نوع کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں نے تخلیقِ افسانہ میں تعلیمی شعور اور آگہی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ”بیک گراؤنڈ“ عمومی و پیشہ وارانہ تعلیم کا پس منظر لیے ہوئے ہے اور کالج کی سطح پر تعلیمِ نسواں کے احساس کا مظہر ہے۔ اس افسانے میں انگریزی زبان سیکھنے کے لیے ہوم ٹیوشن پڑھنے کے رجحان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے معاشرے اور تعلیمی اداروں کی تنگ نظری کی جانب اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ذات پات اور خاندانی پس منظر کو بنیاد بنا کر دوسروں کو تعلیم کے بنیادی حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں مصنف نے تعلیمی اداروں میں رقص و موسیقی سے وابستہ گھرانوں کی بچیوں کو دوسروں کے اخلاق پر منفی اثرات مرتب

CC BY

ہونے کا بہانہ بنا کر تعلیم کے حق سے محروم کر دینے کے نامناسب رویے کی نشاندہی کی ہے۔ اس افسانے میں سوزی ایف ایس سی کی طالبہ ہے۔ اسے کالج سے گلوکاری کے پیشے سے وابستہ خاندان کی فرد ہونے کی وجہ سے نکال دیا جاتا ہے حالانکہ اس کے امتحان بالکل قریب تھے۔ سوزی بتاتی ہے:

> ”ایف ایس سی تک پہنچی لیکن پھر کالج میں کسی نے شکایت کر دی کہ یہ گانے بجانے والوں کی لڑکی ہے، اسے یہاں سے نکالا جائے ورنہ ہماری لڑکیوں کا اخلاق خراب ہو جائے گا۔ کالج والوں نے مجھے نکال دیا اور میں گھر آ گئی حالانکہ میرے امتحان میں ایک مہینہ اور اکیس دن رہ گئے تھے۔“ (۲)

سوزی انگریزی رسالوں کا مطالعہ بھی کرتی ہے اگرچہ زیادہ سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ وہ انگریزی کے ایک پروفیسر سے ٹیوشن بھی پڑھتی ہے۔ یہ پروفیسر ایک کمہار کا بیٹا ہے جو سوزی کو دوناول پڑھاتا ہے مگر سوزی کو دوسری لڑکیوں کی طرح انگریزی نہیں آتی ہے۔ جملے ملاحظہ ہوں:

> ”اس نے انکل پہلے تو مجھے آلیور ٹوسٹ پڑھایا، پھر آنا کریتا شروع کرا دیا۔ میں انگریزی تو سمجھنے لگ گئی، پر مجھے ایسی انگریزی نہیں آئی جیسی ان لڑکیوں کو آتی ہے۔ اس انگریزی میں تنکار بھی ہے اور بھید بھاؤ بھی۔ لہرا بھی ہے اور جھالا بھی۔ یہ تو انگریزی کو گہنے کی طرح پہنتی ہیں۔ وہ مجھے نہیں آتا۔“ (۳)

تربیلا میں ایک انجینئر تھا جو اکثر سوزی سے ملتا ہے۔ اس افسانے میں سوزی، پروفیسر اور انجینئر تعلیمی فکر کے نمائندے ہیں۔ مصنف نے انگریزی ادب کے مطالعے اور انگریزی زبان کے لب و لہجے کی اہمیت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ”چھ حکایتیں“ کئی پہلوؤں سے تعلیمی شعور کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس افسانے میں کالج اور یونیورسٹی سطح کے اعلیٰ تعلیمی رجحان کے ساتھ ساتھ اقتصادی موضوع پر لیکچرز اور تحقیقی مقالات کی اہمیت کو بخوبی اُجاگر کیا گیا ہے۔ معاشیات، طبعیات اور شماریات کی اہمیت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ وزارتِ تعلیم کے کردار کے علاوہ ورلڈ بینک کی معاشی پالیسوں اور ان کے پس پردہ مذموم عزائم کی طرف بھی واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں درس و تدریس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پروفیسر ساعتی اکنامکس کے پروفیسر ہیں اور بہاولنگر کے کالج میں اٹھارہ برس سے تدریس سے وابستہ ہیں۔ وہ سادہ مزاج اور لائق استاد ہیں۔ وہ مصنف کے افراطِ زر کے پوچھے جانے والے سوال پر خیال انگیز اور دلچسپ جواب دیتے ہیں۔ وہ بیرون ملک جا کر مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیتے ہیں۔ ان کی معاشی تحقیق اور علمی سرگرمیوں کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”پروفیسر ساعتی کے مائکرو اقتصادیات پر لکھے ہوئے تحقیقی مقالے زیادہ تر غیر ملکی پرچوں میں چھپتے تھے اور ان انگریزی مضامین کا یورپ کی دوسری زبانوں میں ساتھ ہی ترجمہ ہو جاتا تھا۔ ہر سال کم از کم ایک مرتبہ ان کو ملک سے باہر ضرور جانا پڑتا۔ کبھی کسی سیمینار میں شرکت کے لیے، کبھی اپنے ایکسٹینشن لیکچروں کے سلسلے میں اور کبھی کسی ملک کی حکومتی دعوت پر جو اپنے مالی شعبہ اور اقتصادی سیٹ اپ میں تبدیلی کی خواہاں ہوتی تھی۔۔۔ اسی طرح اپنے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں جب کہیں اور جہاں کہیں کسی اقتصادی ورکشاپ کا قیام ہوتا، اس کے افتتاح کے لیے پروفیسر صاحب کو ضرور زحمت دی جاتی۔“(۴)

پروفیسر ساعتی سکالر کی سبھی خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں اور وہ اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ اُس کے ساتھی انہیں نوبیل لارئیٹ کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ اپنے ریاضی، فزکس، شماریات اور کمپیوٹر کے ساتھی اساتذہ سے ایک مسئلے پر الجھتے رہتے ہیں کہ چھ ضرب چھ چھتیس کی بجائے بتیس ہوتا ہے:

> ”اس مسئلے پر کئی مرتبہ ان کی ریاضیات کے پروفیسروں سے بحث بھی ہوئی اور فزکس کے استادوں کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا۔ شماریات والوں نے بھی احتجاج کیا اور کمپیوٹر سائنس دانوں نے بھی مختلف کمپیوٹروں پر انہیں بار بار ملٹی پلائی کر کے دکھایا لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔ تسلی ہونا تو ایک طرف، انہوں نے اس ایکویشن کو تسلیم ہی نہیں کیا۔“ (۵)

پروفیسر ساعتی سے رفقائے کار مشکل سوالات کرتے ہیں جو وہ حل کر دیتے ہیں۔ اسی مسئلے کے حوالے سے فزکس کے اساتذہ کشش، رفتار، روشنی اور ولاسٹی کے حوالے دیتے ہیں۔ پروفیسر ساعتی حرکیات کے اس مسئلے کو بخوبی حل کر دیتے ہیں۔ پروفیسر شفیق بتیس میں چار کی کمی کو پورا کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ پروفیسر ساعتی فزکس کے پروفیسر شفیق اور شماریات کے پروفیسر جواد کو اپنے پاس بٹھا کر فارمولہ سمجھاتے ہیں۔ پروفیسر ساعتی پبلک سروس کمیشن کے ذریعے اسسٹنٹ پروفیسر ہونے میں ہر بار ناکام ہو جاتے ہیں کیونکہ انٹرویو کے دوران بار بار چھ چھکے بتیس یا چھتیس کا سوال پوچھا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔

نیلم احمد بشیر کا افسانہ ”کالی دھوپ“ عورتوں کے تعلیمی تدبر کا بہترین عکاس ہے۔ افسانے میں عورتوں کی کالج سطح کی تعلیم اور درس و تدریس سے وابستگی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہ افسانہ عورت کے پرنسپل کے عہدے اور اس کی انتظامی صلاحیتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ سکول کے ماحول اور طلبہ و ملازمین کے ساتھ رویے اور کامیاب تعلیمی ماحول کا مظہر ہے۔ اس افسانے میں مونا کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔ اس کی والدہ سکول کی پرنسپل ہے جو وقت کی پابند ہیں۔

CC BY

مونا کی والدہ کی شخصیت پر نسپل ہونے کے سبب منجمد ہے۔ وہ نظم و ضبط کے سلسلے میں خاصی سختی سے کام لیتی ہیں۔ افسانے میں انگریزی زبان کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ وہ اشارے سے ہی بات سمجھا دیتی ہیں۔ طالب علم دیکھ لیں تو فوراً سناٹا چھا جاتا ہے۔ ٹیچر کے قہقہے گم ہو جاتے ہیں اور ملازم اپنے کام میں فوراً مگن ہو جاتے ہیں۔ اتنی مستعد پرنسپل کی کارکردگی کے سبب سکول کی عمارت کسی بھی طرح کے نقصان سے محفوظ ہے۔ مونا بتاتی ہے:

"وہ اپنی انگلی کے اشارے سے ہی اپنی بات سمجھانے کی عادی تھیں۔ فالتو باتیں کرنے کا انہیں کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ اگر کسی کلاس روم کے آگے سے گزر جائیں تو سٹوڈنٹس کو سانپ سونگھ جاتا۔ لان میں سے ہو کر آفس کو جاتیں تو پھول پتے سانس روک لیتے۔ سٹاف روم کی طرف آ نکلتیں تو ٹیچرز کی گپیں اور قہقہے گلے میں گھٹ کر رہ جاتے۔ نوکر طبقہ سکول کی صفائی ستھرائی میں مستعدی سے جٹ جاتا اور سکول کی عمارت مضبوطی سے قدم جمائے ان کی طرف اطمینان سے کھڑی دیکھتی رہتی ہے کہ ان جیسی فرض شناس، قابل، اپنے کام سے کمیٹڈ پرنسپل کے ہوتے ہوئے سکول کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو سکتی تھی۔" (۶)

مصنف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ گھریلو ملازمین عورتیں بھی اپنے بچوں کو انگریزی سکول میں تعلیم کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ مونا گھر میں اپنی والدہ کو اپنی کالج کی سرگرمیوں، لطیفوں اور باتوں سے ہنساتی بھی ہے۔ وہ اپنی ملازمہ کی بیٹی شریفاں عرف شیری کو انگریزی بھی سکھاتی ہے۔ شریفاں کی ماں غلام فاطمہ سوچتی ہے کہ کاش اس کی بیٹی کسی انگریزی سکول میں زیر تعلیم ہوتی۔

نیلم احمد بشیر کا افسانہ "مفلس" تعلیمی دانش کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ افسانہ خواتین کا تعلیم حاصل کرنا، کورسز کرنا اور پھر اعلیٰ اور مہنگے سکول میں درس و تدریس سے وابستہ ہونے کی تصویر کشی کرتا ہے۔ افسانے میں مہنگے سکول کے ماحول، تعلیمی مسائل اور والدین کی پریشانی کی بھی جھلک دکھائی گئی ہے۔ مصنف نے والدین کے اپنے کاموں میں مصروف رہنے اور بچوں کو وقت نہ دینے کے سبب تعلیم میں کمزوری اور ناکامی کے اہم مسئلے کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ اس افسانے میں علیمہ فارن سکول میں ٹیچر ہے۔ وہ بڑی ذمہ دار، اصول پرست اور فرض شناس ٹیچر ہے۔ علیمہ کی ماں کو بھی اپنی بیٹی کی قابلیت، قسمت اور ملازمت پر بڑا فخر ہے۔ ماں خود بتاتی ہے:

"علیمہ کی سکول ٹیچنگ جاب ویسے اتنی بری بھی نہیں ہے۔ لوگ تو ایسے سکولوں میں جاب حاصل کرنے کے لیے ترستے ہیں۔ اتنے ہائی سٹینڈرڈ کے فارن سکول میں ہر کوئی ٹیچر لگ بھی نہیں سکتا۔ اس کے لیے بہت سے کورسز کرنے ہوتے ہیں جو علیمہ نے کر رکھے ہیں اور اب وہ کلاس دوئم کے بچوں کی کلاس ٹیچر ہے۔" (۷)

علیمہ جس فارن سکول میں ٹیچر ہے اُس کی ماں اُس سکول کے ماحول اور معیار سے بڑی متاثر ہے کہ حکمرانوں، سیاستدانوں اور جاگیرداروں کے بچے ہی ایسے لاکھوں روپے فیس والے سکولوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ علیمہ کی ماں اس فارن سکول میں داخلے اور سیکورٹی کے معیار کو سراہتی ہے اور ایسے اعلیٰ سکولوں کے قیام کو پاکستان کے لیے نعمت گردانتی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتی ہے کہ ایسے سکول کا قیام امیروں کے لیے ضروری ہے ورنہ یہ عام بچوں کے ساتھ ٹاٹ والے سکول میں تعلیم کیسے حاصل کر سکتے ہیں:

"یہ سکول ایسا ہے جہاں ہر ایرا غیرا اندر بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ کئی قسم کی چیکنگ اور سکریننگ ہوتی ہے جب کہیں جا کر آپ کو اندر جانا نصیب ہوتا ہے۔ شکر ہے پاکستان جیسے غریب، فقیر ملک میں بھی امیر کبیر لوگوں کے لیے فارن سکولوں کی کوئی کمی نہیں۔ سوچنے کی بات ہے ایسے ہائی کلاس سکول نہ ہوتے تو بے چارے جاگیردار، سیاستدان، کھلاڑی، حکمران اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے کہاں بھیجتے۔ ان کے بچے اب ٹاٹ سکولوں میں اپنی کل کی ہونے والی رعایا کے بچوں کے ساتھ یکساں تعلیم حاصل کرنے سے تو رہے۔" (۸)

افسانہ نگار نے یہاں طنز ملیح سے کام لیا ہے اور معاشرے کے طبقاتی نظام پر چوٹ کی ہے۔ نظامِ تعلیم کے دو طبقات میں تقسیم ہونے کے عمل اور اس کے نتائج و تدارک پر پروفیسر خورشید احمد یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"تعلیمی نظام بھی دو طبقوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طبقہ میں وہ اسکول اور کالج ہیں جن میں عام آدمیوں کی اولاد تعلیم پا رہی ہے اور دوسرا طبقہ مشتمل ہے ان غیر ملکی مشنری اور اعلیٰ اداروں پر، جن میں ہمارے حکمران اور خواص تعلیم پاتے ہیں۔۔۔ خاص اداروں اور دوسرے عام اداروں کے طلبہ کے فکر و نظر، نشست و برخاست، اندازِ تکلم و تخاطب، ہر چیز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔۔۔ قومی وحدت کا تقاضا ہے کہ اس دوئی کو بھی ختم کیا جائے اور ان غیر ملکی اور اعلیٰ طبقاتی اداروں کو جو مغرب کے تمدنی سامراج کی چوکیاں ہیں، قومی تعلیمی نظم کے تحت لایا جائے۔" (۹)

مسعود اشعر کا افسانے "اکیسویں صدی کی پہلی کہانی" پیشہ وارانہ تعلیمی ادراک کا مظہر ہے۔ مصنف نے مرد اور عورت دونوں کے تعلیمی شعور کی عکاسی کی ہے۔ شادی جیسے اہم معاملے کے بعد بھی زن و شوہر ایک دوسرے کے تعاون سے تعلیمی عمل جاری رکھ سکتے ہیں اور نہ صرف خود کو بلکہ اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کر سکتے ہیں۔ مصنف نے درس و تدریس سے وابستگی اور اس کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا ہے نیز انگریزی زبان و ادب، کامرس اور طب کی پیشہ وارانہ تعلیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ افسانے میں بیرونِ ملک سے تعلیم حاصل کرنے کی روش کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ مصنف نے اولیول اور اے لیول کے طرزِ تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحان کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ اس افسانے میں احمد اور ایمن کی دادو شادی کے وقت میٹرک پاس تھیں:

"شادی ہوئی تو وہ میٹرک تھی۔۔۔اب دادو نے انٹر کیا، بی۔اے کیا اور پھر ایم۔اے بھی کر لیا۔ اور ملازمت شروع کر دی اب وہ پڑھا رہی تھیں۔ دوسروں کے بچوں کو بھی اور اپنے بچوں کو بھی۔" (۱۰)

پروین عاطف کا افسانہ "ذلت" مرد اور عورت دونوں کی تعلیمی اندازِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ یہ افسانہ عورتوں کے درس و تدریس سے وابستگی اور دل چسپی کا بھی غماز ہے۔ مصنفہ نے کمپیوٹر کی تعلیم و تربیت اور آن لائن تدریس کے رجحان کی بھی بخوبی عکاسی کی ہے۔ اس افسانے میں گلوبل ولیج کے جدید تصوّر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس افسانے میں طاہرہ بیگم اکنامکس کی پروفیسر ہے۔ اسے دُنیا کے بارے میں جاننے کا بھی شوق ہے۔ وہ اپنی ماں کو "گلوبل ولیج" کے بارے میں بتاتی ہے:

"طاہرہ بیگم خود ایم اے پاس تھی۔ ملازمت اور گھر داری کے علاوہ اسے دُنیا کے حالات جاننے، سننے اور سمجھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔۔۔"ماں دُنیا کو اب سکیڑ کر ایک عالمی گاؤں کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ یعنی "گلوبل ویج" اب پوری دُنیا ایک ہی گاؤں بن جائے گی۔" (۱۱)

خالد فتح محمد کا افسانہ "ٹیس" مرد اور عورت دونوں کے تعلیمی ادراک کا مظہر ہے۔ اس افسانے میں وہ (واحد مونث غائب) دفتر میں ملازم ہے۔ وہ ایک معروف کمپنی میں ایک مناسب عہدے پر تعینات ہے اور انتہائی ذہین اور ایک تعلیم یافتہ عورت ہے۔ واحد متکلم بھی دفتر میں ملازم ہے۔ دونوں کردار لکھنے پڑھنے کے ترجمان ہیں نیز تعلیم ہی روزگار حاصل کرنے اور کسی عہدے یا مرتبے پر فائز ہونے کا مناسب اور بہترین وسیلہ ہے۔

خالد فتح محمد کا افسانہ "سڑک کے دونوں طرف" مرد اور عورت دونوں کے تعلیمی تدبر کا عکاس ہے۔ لڑکیوں کا ماسٹر تک تعلیم حاصل کرنا معاشرے کی تعلیمی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ یہ افسانہ وکالت کی تعلیمی اہمیت کا بھی مظہر ہے۔ اس افسانے میں شاکر مارک اینڈ پیٹسر کا ایم ڈی ہے۔ ہاشم کارپوریٹ وکیل ہے۔ شاکر کا بیٹا عمر بھی ایک بین الاقوامی فرم میں ملازم ہے۔ مسز ریحانہ ہاشم شاکر کو بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی نے ماسٹر کیا ہے۔ شاکر کے دیگر ہم جماعت بھی اس کے گھر آتے جاتے ہیں۔ شاکر اپنی ملازمت کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے مسز ریحانہ ہاشم کو بتاتا ہے کہ چھبیس سال حصولِ تعلیم کے فوراًبعد ہی اسے نوکری مل گئی تھی۔ "بزنس ایڈمنسٹریشن میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے فوراًبعد مجھے ملازمت مل گئی۔" (۱۲) اس افسانے میں شاکر، ہاشم، عمر، ہاشم کی بیٹی، شاکر کے کلاس فیلوز تعلیمی فکر کے نمائندے ہیں۔ یہ افسانہ بزنس کی پیشہ وارانہ تعلیم کے ادارک کا بھی عکاس ہے۔ نیز تعلیم ہی ملازمت اور عمدہ عہدے کے حصول کا مناسب ذریعہ ہے۔

خالد فتح محمد کا افسانہ "کھلی گلی" تعلیمی فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ تعلیم ہی روزگار اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ بعض اوقات انسان تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود غلط روش کے باعث خانگی زندگی یا اپنا تعلیمی سفر برباد کر بیٹھتا ہے۔ تعلیم ہی درست راستے کے تعین کا ذریعہ ہے۔ اس افسانے میں اسحاق ایف۔اے میں زیرِ تعلیم تھا جب وہ ایک قتل کی وجہ سے جیل چلا جاتا ہے۔ سکول کے ابتدائی دنوں میں اس کی بھابی زبیدہ اس کا خاص خیال رکھتی ہے۔ اسحاق کو بھی بھابی زبیدہ سے بڑی وابستگی ہوتی ہے:

"اور جب سکول جانے کے قابل ہوا تو اسے گیٹ تک چھوڑنے جاتی۔ گھر کا کام نہ کیا ہوتا تو اسحاق کے ساتھ مل کر سکول میں جھوٹ بولتی۔ اسحاق دن میں جب تک کئی مرتبہ زبیدہ کو دیکھ نہ لیتا تو اسے چین نہ آتا۔" (۱۳)

زبیدہ کا شوہر بھادلدار آفیسرز کالونی میں رہائش پذیر ہے۔ وہ پہلے انسپکٹر تھا مگر پھر ترقی ملنے کے بعد انکم ٹیکس آفیسر ہو گیا تھا۔ بھادلدار انکم ٹیکس کمشنر بننے کی دھن میں زبیدہ کو نظر انداز کرنے لگا۔ بعد ازاں اسحاق بھابی زبیدہ کی طرف دیکھنے والے شخص کو قتل کر دیتا ہے۔ بھادلدار زبیدہ کو طلاق دے کر فیروزہ سے شادی کر لیتا ہے۔ زبیدہ کا بیٹا طلعت بھادلدار کے پاس ہوتا ہے اور سکول میں زیرِ تعلیم ہے۔ جیل میں جب طلعت بھادلدار کے ساتھ اسحاق سے ملاقات کرنے آیا تو اپنے سکول اور کرکٹ کی خوب باتیں کیں۔ اس افسانے میں بھادلدار، اسحاق اور طلعت لکھنے پڑھنے کے عمل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس افسانے میں کرکٹ کے تذکرے سے تعلیمی اداروں میں غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

نیلوفر اقبال کے افسانے "عورت" میں فنونِ لطیفہ کی تعلیم کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ افسانہ فنِ مصوّری کے ادراک کا ترجمان بھی ہے نیز فنِ موسیقی کی اہمیت بھی اُجاگر کرتا ہے۔ تعلیم ہی روزگار کا ذریعہ ہے۔ افسانے میں تعلیم و تعلم کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں ریحانہ نے فائن آرٹس کی تعلیم حاصل کی ہے اور بہترین پینٹنگ کرتی ہے۔ وہ اپنی تصاویر کی نمائش کرنے کی تیاری میں مگن ہے۔ مسعود ریحانہ کو پسند کرنے لگتا ہے اور شادی کا خواہاں ہے۔ مسعود اپنی والدہ سے بھی ریحانہ کے بارے میں بات کرتا ہے اور ان کو قائل کرنے کے لیے کہتا ہے:

"امی! انسان میں کچھ اور بھی تو ہوتا ہے، صرف رنگ ہی تو نہیں ہوتا۔ مجھے اس کی پرسنیلٹی اچھی لگی ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ فائن آرٹس میں ایم اے کیا ہے اُس نے۔ بیوی ایسی ہونی چاہیے جس کے ساتھ آدمی کم از کم بات کر سکے۔" (۱۴)

مسعود خود بھی ایک فنکارانہ ذہن کا مالک ہے۔ وہ ستار سیکھنے کے لیے آرٹ کونسل بھی جاتا ہے۔ مسعود ایک دفتر میں ملازم ہے۔ شادی کے بعد مسعود نے گھر کی تنہائی اور بوریت سے بچنے کے لیے ریحانہ کو پینٹنگ کا کام شروع کرنے اور اس کا دائرہ کار بڑھانے کا بھی کہا۔ مسز راحیل جو خود کو ماریہ بھی کہتی ہے، ستار سکھانے کے لیے آرٹس کونسل میں جاتی ہے۔

عطیہ سید کے افسانے "ایک عام معمولی آدمی" میں اعلیٰ تعلیمی فکر کا احساس اُجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے میں ادبی، سائنسی اور قانونی تعلیم کے رجحان کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ افسانے میں درس و تدریس سے وابستگی اور بیرونِ ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ واحد متکلم بتاتا ہے کہ اس کی تدریسی ملازمت کا آغاز پہاڑوں پر واقع قصباتی شہر سے ہوا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات انگریزی کے شاعر داؤد جمال سے ہوئی تھی۔ دونوں گرین کیفے نام کے ایک ریسٹوران میں ملنے لگے تھے۔ ادبی موضوعات پر باہم بات چیت اور ایک دوسرے کو

cc BY

اپنی تحریریں سننے سنانے لگے تھے۔ گرین کیفے میں اور بھی دوست ملاقات میں شامل ہوگئے۔ ان میں پاشا اور حماد حسن بھی شامل تھے جو پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ آخر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی جدوجہد میں ختم ہوگیا۔ پاشا سپریم کورٹ کا جج بن گیا۔ مرکزی کردار خود فزکس میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مشرقی یورپ چلا گیا۔ حماد قانونی مشیر بن گیا۔ واحد متکلم مزید کہتا ہے کہ وہ مشرقی یورپ میں ہی پی ایچ۔ ڈی کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہوگیا مگر روس کے منتشر ہونے کی وجہ سے وطن واپس لوٹ آیا:

> "پاشا نے مقابلے کے عدالتی امتحان پاس کیے اور ضلعی عدالتوں سے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ کا جج بن گیا۔ میں وظیفے پر مشرقی یورپ کی ایک یونیورسٹی میں فزکس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گیا اور پھر وہیں کا ہوگیا۔ شنید تھی کہ حماد حسن بھی اپنے بڑے شہر کو لوٹ گیا جہاں وہ اپنے اشتراکی خیالات کے باوجود ایک مشہور صنعت کار کا قانونی مشیر بن گیا۔ زندگی کے اس لمبے سفر میں جو برسوں پر محیط تھا ہمارا کبھی آمنا سامنا نہ ہوا۔ میں پی ایچ۔ ڈی کے بعد مشرقی یورپ ہی میں تدریس کے شعبے سے منسلک ہوگیا تھا مگر سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ نتیجتاً ان کے زیر اثر مشرقی یورپ کے اشتراکی ممالک میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ واپس وطن لوٹ جاؤں۔" (۱۵)

واحد متکلم بتاتا ہے کہ جب وہ واپس آیا تو پاشا کا پتا بھی معلوم ہوگیا۔ وہ جب حماد سے ملنے اس کے گھر گیا تو اُس نے اُسے اپنی نثری نظموں کے مجموعے کی کتاب پیش کی۔ ڈاکٹر نے حماد کو سگریٹ اور شراب سے پرہیز کرنے کا کہا۔ آخر وہ ایک دن ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ اس افسانے میں واحد متکلم، داؤد جمال، پاشا اور حماد تعلیمی بصیرت کے نمائندے ہیں۔ افسانے میں ادب، اُردو اور انگریزی زبان میں شاعری کی تخلیقی صلاحیتوں کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے۔

نیز اقبال علوی کے افسانے "غیر مشروط محبت" میں مرد اور عورت دونوں کے یونیورسٹی سطح کے تعلیمی ادراک کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں درس و تدریس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اُردو ادب کی ترقی اور فروغ کی کاوشوں کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے مخلوط تعلیم اور اس کے اثرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس افسانے میں شگفتہ ایک کتاب کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں ایک نوجوان سردار صحافی پروفیسر افضل توصیف صاحبہ سے درس و تدریس اور ادب کی خدمت سے ہٹ کر شادی نہ کرنے کا سوال پوچھتا ہے:

> "پروفیسر صاحبہ! آپ عمر بھر درس و تدریس سے منسلک رہیں۔ اپنے فارغ اوقات کو پنجابی اور اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کیے رکھا۔ اس مصروفیت بھری زندگی کے تناظر میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔۔۔ آپ نے زندگی بھر شادی کیوں نہ کی۔" (۱۶)

شگفتہ اور حامد علی کی باہمی شناسائی یونیورسٹی ایام سے ہی ہے۔ دونوں کے درمیان گہری دوستی ہے اور ایک دوسرے کے خیالات، جذبات اور احساسات سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں۔ حامد علی پیشے کے لحاظ سے سب ایڈیٹر ہے۔ شگفتہ کو حامد علی کے پیشے سے نفرت ہے اور خاص طور پر صحافی خواتین سے ملنا تو بالکل بھی گوارا نہیں ہے۔ حامد علی اپنی بیوی کو اطہر غوری کی ایک نظم "ثنویت" بھی اونچی آواز میں پڑھ کر سناتا ہے۔ حامد علی صبح سے شام تک دفتر میں مصروف رہتا ہے:

> "صبح سویرے دفتر جاتا، دن بھر کام کاج میں مصروف رہنے کے بعد شام گئے لوٹتا، رات دیر تک کتابی مطالعے کے بعد نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔" (۱۷)

اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود شگفتہ اور حامد علی کے درمیان علیحدگی ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں شگفتہ، پروفیسر افضل توصیف، صحافی اور حامد علی تعلیمی بصیرت کے مظہر ہیں۔ یہ افسانہ کتاب بینی کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ یہ افسانہ ادب اور صحافت کے رجحان کا بھی ترجمان ہے۔

اسد محمد خاں کے افسانے "ماشٹر" میں لکھنے پڑھنے کا رجحان نمایاں ہے۔ مصنف نے تاریخ نویسی اور داستان گوئی کے فن کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ یہ افسانہ کہانی لکھنے کی تخلیقی صلاحیت کو بھی آشکار کرتا ہے۔ اس افسانے میں واحد متکلم کہانیاں تحریر کرتا ہے۔ بمبئی ماشٹر داستان گو ہے۔ وہ کہانیاں سناتا بھی ہے اور اسے کہانیاں پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ واحد متکلم بتاتا ہے:

> "وہ ہم لڑکوں اور بعض ہمسائیوں کا ایک دم 'ذاتی' داستان گو تھا۔ اسے کہانیاں سنانے کے ساتھ کہانیاں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ وہ خود کو بلند آواز میں اسلامی تواریخی ناولیں اور بہرام ڈاکو کی کہانیاں پڑھ کے سنایا کرتا تھا۔" (۱۸)

ڈاکٹر ملک حسن اختر تعلیم میں کہانی کی افادیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "بچے کو کہانی کے ذریعے تعلیم آسانی سے دی جا سکتی ہے اور اسے ایک خاص طرح کا انسان بننے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے بچے کو تعمیری کام کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔" (۱۹)

جب ماشٹر کہانیاں یا ناول نہیں پڑھتا ہے تو اپنے پاس بیٹھے لوگوں کو اپنے معرکوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ وہ اپنی پھکیتی، جیب کتری اور چوری کے حوالے سے بھی کہانیاں سناتا ہے۔ اس افسانے میں ماشٹر لکھنے پڑھنے کے رجحان کا ترجمان ہے۔ قدیم کہانیوں کا لکھنا پڑھنا اور پڑھ کر لوگوں کو سنانا تعلیمی فکر کا مظہر ہے۔

محمد سعید شیخ کا افسانہ "عمر دراز" سکول اور کالج سطح تک کی تعلیمی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ افسانے میں مرد اور عورت میں انجینئرنگ اور میڈیکل کے پیشہ ورانہ تعلیمی تدبر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ افسانہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری، ٹیوشن اور اکیڈمی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے، نیز والدین اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنی ہستی قربان کر دیتے ہیں اور اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس افسانے میں عالم صاحب اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہیں۔ عالم صاحب نے ایامِ طالب علمی سے ہی کئی خواب آنکھوں میں سجا مگر ذمہ داریوں کے باعث مناسب

وقت نہ ملنے کی وجہ سے وہ خواب تشنہ رہ گئے۔ ملازمت کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ ازدواجی ذمہ داری میں بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر بچے بڑے ہوئے تو ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اسے مختلف ذمہ داریاں نبھانا پڑیں۔ نتیجتاً اس کے اپنے خواب ادھورے رہ گئے:

> ”بیٹی کلاس ون میں تو بڑا بیٹا پریپ میں، بڑا بیٹا کلاس ون میں تو چھوٹا بیٹا پریپ میں۔ دو بچے بڑی کلاس میں تو چھوٹا چھوٹی کلاس میں۔ ایک کا سکول ایک طرف تو دوسرے کا شہر کی دوسری جانب۔ پھر سکولوں میں بچوں کی تعلیمی سرگرمیاں، غیر نصابی مشاغل، یوم والدین، ایک ایک پوزیشن، ایک ایک نمبر کے لیے بچوں کے والدین کی لڑائیاں، ہوم ورک میں بچوں کی مدد کرنا جس کے بغیر وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سکولوں سے آگے کالجوں کا سلسلہ، مضامین کا انتخاب، انٹری ٹیسٹ، میڈیکل، نان میڈیکل اور پھر الیکٹرونکس، کمپیوٹر، پرائیویٹ ٹیوشن، اکیڈمیاں، اسے تو جیسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ ہو۔ ”چلو اچھا ہے تینوں بچے ایک ساتھ بڑے ہو جائیں گے۔ پڑھ لکھ کر کوئی مقام حاصل کر لیں گے تو یہاں ذمہ داریاں بھی کم ہو جائیں گی۔“ (۲۰)

سمیع آہوجا کا افسانہ ”زخم حشم پکھاوجی دے تھاپ“ تعلیم نسواں کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس افسانے میں رقص اور موسیقی کی تعلیم کی صورت فنونِ لطیفہ کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

> ”بڑی کا پندرہواں سال ختم ہوا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے رقص و موسیقی کے بل پر ٹیوشن دیتے، میٹرک کا پرائیویٹ امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا، میوزک اکیڈمی کے زیر اہتمام سٹیج شو میں اُوپر تلے اُس نے تین سولو رقص پیش کیے کہ گڈی چڑھ گئی۔۔۔“ (۲۱)

اس افسانے میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک متوسط زمیندار طبقے میں مسجد مدرسے کی عربی اور فارسی کی تعلیم اور سکول سے آٹھ جماعتوں تک کی تعلیم کو کافی تصور کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں بڑی فنونِ لطیفہ اور تعلیمِ نسواں کے رجحان کی بہترین ترجمان ہے۔ مصنف نے حصولِ تعلیم میں مالی مشکلات کی طرف بھی متوجہ کیا ہے، نیز زمینداروں میں کم تعلیم کو بھی کافی سمجھنے کے رویّے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

علی اکبر ناطق کا افسانہ ”والٹر کا دوست“ کالج سطح کے تعلیمی تدبّر کا غماز ہے۔ افسانے میں درس و تدریس کی اہمیت اور طلبہ میں مطالعہ کے رجحان کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ دیہاتی طلبہ کو مزید تعلیم کے لیے شہروں کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ دیہاتوں کی نسبت شہروں میں تعلیمی مواقع اور سہولیات زیادہ ہیں۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ دیہاتی طلبہ شہروں میں جا کر احساسِ کمتری کا بھی شکار ہو جاتے ہیں جس سے ان کی تعلیم بھی بعض اوقات متاثر ہوتی ہے۔ مصنف نے تعلیمی اداروں میں سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے قیام، ان کے کردار اور تعلیمی عمل پر ان کے اثرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ واحد متکلم یوں بیان کرتا ہے:

> ”کالج میں میرا پہلا دن تھا اور پچاس لڑکوں کی کلاس میں کوئی دوست نہ تھا۔ گاؤں کے اسکولوں میں میٹرک کرنے والے لڑکوں میں جو ایک قسم کا احساسِ کمتری پایا جاتا ہے، وہ مجھ میں بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں سب سے آخر میں جا کر بیٹھ گیا۔ اُس دن اساتذہ نے جتنے لیکچر دیے ایک کی بات بھی میرے پلّے نہ پڑی۔ دوسرا اور تیسرا دِن بھی ایسے ہی گزرا۔ گاؤں کی پچھلی پندرہ سولہ سالہ زندگی میں کبھی کبھار ہی شہر آیا تھا، لہٰذا اجنبیت ایک فطری عمل تھا۔ چوتھے دِن جو نہی کلاس میں داخل ہوا سامنے کے ڈیسک پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔۔۔ چند دنوں میں ہماری دوستی مثالی کہلانے لگی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے پہلے تمام دوستوں اور کلاس فیلوز کو نظر انداز کر دیا۔ ہمارے پانچوں پیریڈ اکٹھے تھے۔“ (۲۲)

اس افسانے میں واحد متکلم علی، عمر، والٹر اور یوسف کے علاوہ دیگر مذکورہ کردار تعلیمی فکر کے ترجمان ہیں۔ مصنف نے تعلیمی اداروں میں متعصبانہ رجحانات اور اس کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نیز تعلیمی اداروں کے معاملات اور نظم و ضبط کے عمل پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ افسانے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ذرائع آمد و رفت کی مشکلات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز تعلیمی ماحول، طلباء کی سرگرمیوں اور طلبا کے باہمی میل جول اور ٹیوشن پڑھنے کے رجحان کی بھی منظر کشی کی گئی ہے۔

اردو کے جدید افسانوں میں تعلیمی شعور کی بہترین پیش کش کی گئی ہے اور ایک فعال اور متحرک تعلیمی منظر نامہ تشکیل دیا گیا ہے۔ افسانوں میں سکول، کالج اور یونیورسٹی سطح پر مرد اور عورت دونوں کی تعلیمی بصیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مخلوط تعلیم اور اس کے منفی اثرات پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹری، انجینئرنگ، وکالت، کامرس، تاریخ، اسلامیات، فلسفہ، ریاضی، لٹریچر، مذاہب کا مطالعہ، لغت کا مطالعہ، معاشیات، شماریات، طبیعیات اور بینکنگ وغیرہ کے تعلیمی رجحان کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سائنسی علوم، نظریات، کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کی افادیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تعلیمی اداروں کی عمارات، کلاس کے ماحول، طلبہ کے باہمی میل جول، مختلف سرگرمیوں اور تعلیمی ماحول کی بھی عمدہ تصویر پیش کی گئی ہے۔ امتحانات میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے اور وظائف حاصل کرنے کے شوق کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ کیمبرج کی تعلیم، اولیول، اے لیول، بیرونِ ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور بعض اوقات وہیں مقیم ہو جانے کے رجحان کا بھی ذکر ہے۔ مرد اور عورت دونوں کی درس و تدریس سے وابستگی، ٹیوشن پڑھنے اور پڑھانے کے عمل، اکیڈمی کے بڑھتے ہوئے رجحان اور انٹری ٹیسٹ کی تیاری کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اُردو، انگریزی، عربی، فارسی اور دیگر زبانوں کے سیکھنے کے شوق کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ پبلک سروس کمیشن، مقابلے کے امتحان، ٹوفل اور سیٹ کے امتحانات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

CC BY

اُردو میڈیم اور انگریزی میڈیم طرزِ تعلیم اور اس کے تفاوت کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ذات پات اور رنگ نسل کے امتیازی سلوک کے باعث لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کے رویّوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ دیہاتوں میں تعلیمی سہولیات کے فقدان، پسماندگی اور وسائل کی کمی کے باوجود وہاں تعلیمی اداروں کے قیام، لوگوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے جذبے اور خاص طور پر خواتین کی تعلیم اور درس وتدریس سے وابستگی کی بخوبی جھلک پیش کی گئی ہے۔

دیہاتوں میں انٹرنیٹ اور سائنس کی تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دیہاتی طلبہ و طالبات شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔ وہ ہوسٹل میں یا کسی عزیز کے ہاں قیام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور انہیں شدید مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیہاتی بچوں کے لیے ایک مسئلہ ذرائع آمدورفت بھی ہے۔ دیہاتی والدین اپنی اولاد کے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواہش کے باوجود تعلیمی اخراجات، مالی وسائل کی کمی اور تنگ دستی کی وجہ سے اپنے بچوں کی تعلیم ترک کرا کر انہیں اپنے خاندانی اور آبائی کام میں لگا لیتے ہیں۔ بعض اوقات غریب اور اَن پڑھ والدین قرض لے کر اپنی اولاد کو تعلیم دلواتے ہیں تاکہ وہ روزگار حاصل کر سکیں مگر کمرۂ جماعت میں استاد کی پڑھانے میں عدم دلچسپی کی وجہ سے غریب بچے ٹیوشن کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں اور وسائل کی عدم دستیابی کے باعث ناکام رہ جاتے ہیں۔ کلاس روم میں استاد کے متشددانہ اور ہتک آمیز رویّے کے ساتھ ساتھ استاد کے مشفقانہ کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور استاد اور شاگردوں کے مثبت اور خوشگوار روحانی تعلق کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔

تعلیم کی بدولت ہی روزگار اور ملازمت حاصل کی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر عورت اپنا روزگار حاصل کر کے اپنی ازدواجی زندگی کے مسائل کو سنبھال سکتی ہے۔ خود کو اور اپنی نسل کو محتاجی سے بچا سکتی ہے۔ بعض اوقات دورانِ تعلیم ہی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔ اکثر اوقات والدین اپنی اولاد کو اپنی مرضی کی تعلیم دلوانے کے خواہش مند ہوتے ہیں جس میں انہیں ناکامی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اردو افسانے میں تعلیمی اداروں میں مذہبی اور سیاسی تنظیموں کے عمل دخل، کانووکیشن اور سیمینار کے انعقاد اور افادیت پر بھی نگاہ ڈالی گئی ہے۔

جدید اردو افسانہ سماجی اور عصری شعور کا آئینہ دار ہے اور اس میں معاصر دنیا اور زندگی کے مختلف سیاسی، معاشی، معاشرتی، جنسی اور نفسیاتی حوالوں کی معنی خیز اور بصیرت افروز تعبیر اور تشریح پیش کی گئی ہے۔ عصری زندگی کا ایک روشن حوالہ 'تعلیم' اور 'تدریس' ہے جس کے مختلف سماجی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی زاویے ہیں۔ جدید اردو افسانے میں ان تمام حوالوں اور زاویوں کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور تعلیمی زندگی کے معاملات، انتظامات اور تصورات کی نشاندہی کی گئی ہے، نیز تعلیمی ماحول اور سرگرمیوں کو کہانی اور کرداروں کی زبانی، آگہی اور شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

CC BY

حوالے:

۱۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، **جدید اُردو افسانے کے رجحانات**، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۰ء، ص:۴۷۰

۲۔ اشفاق احمد، اماں سردار بیگم، **صبحانے فسانے**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص:۲۴۴

۳۔ ایضاً، ص:۲۴۶

۴۔ اشفاق احمد، چھ حکایتیں، **طلسم ہوش افزا**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص:۴۰

۵۔ ایضاً، ص:۴۱

۶۔ نیلم احمد بشیر، کالی دھوپ، **ایک تھی ملکہ**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۲۰

۷۔ نیلم احمد بشیر، مفلس، **وحشت ہی سہی**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص:۷۴

۸۔ ایضاً

۹۔ خورشید احمد، پروفیسر، **نظام تعلیم (نظریہ۔روایت۔مسائل)**، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۱۹۹۳ء، ص:۳۶۔۳۷

۱۰۔ مسعود اشعر، اکیسویں صدی کی پہلی کہانی، **اپنا گھر**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص:۱۷۱

۱۱۔ پروین عاطف، ذلّت، **صبح کاذب**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص:۱۲۹۔۱۳۰

۱۲۔ خالد فتح محمد، سڑک کے دونوں طرف، **جمع تقسیم**، گوجرانوالہ، ایم (Aim) پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص:۴۱

۱۳۔ خالد فتح محمد، کھلی گلی، **جمع تقسیم**، ص:۷۰

۱۴۔ نیلوفر اقبال، عورت، **سرخ دھبے**، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۶۱

۱۵۔ عطیہ سید، ایک عام معمولی آدمی، **دشت، بارش اور رات**، لاہور: دستاویز، ۲۰۱۳ء، ص:۲۱۳۔۲۱۴

۱۶۔ نیّر اقبال علوی، غیر مشروط محبت، **سلسلۂ روز و شب**، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، اشاعت اوّل، ۲۰۰۵ء، ص:۱۱۶

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۱۷

۱۸۔ اسد محمد خاں، ماشٹر، **تیسرے پہر کی کہانیاں**، لاہور: اِلقا پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۲۶

۱۹۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، **تعلیم کا فن**، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۹ء، ص:۳۹

۲۰۔ محمد سعید شیخ، عمر دراز، **زمین کا دکھ**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۱۹۹

۲۱۔ سمیع آہو جا، زخم حشم پکھاوَجی دے تھاپ، **کشکول بدن**، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۶۵

۲۲۔ علی اکبر ناطق، والٹر کا دوست، **قائم دین**، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص:۱۱۷

cc BY